سرسید، رینے، خطبات اقبال: جدیدیت کے نفوذ کے تین طریقے

چوموج ساز وجودم زسیل بے پروا است
گماں مبر کہ دریں بحر ساحلے جو یم

عالم اسلام کو جدیدیت کے ذریعے مغرب میں سمونے کا کام تین سطحوں پر کیا گیا۔ تصوف کی سطح پر رینے گینوں، تہذیب کی سطح پر سرسید احمد خان اور فکر کی سطح پر خطبات اقبالؒ نے یہ کام سرانجام دیا۔ المیہ یہ ہے کہ سید جمال الدین افغانی، عبدہٗ، سرسید، رشید رضا وغیرہ نہ انگریزی سے واقف تھے۔ نہ مغربی فکر وفلسفے سے لہٰذا یہ مغرب کو سمجھنے کی اہلیت ہی نہ رکھتے تھے۔ علامہ اقبالؒ واحد مفکر تھے جو مغربی فلسفے سے آگہی رکھتے تھے لیکن علوم اسلامیہ سے واقف نہ تھے اور مغربی فکر وفلسفے سے ان کی واقفیت بھی نہایت گہری نہ تھی۔ کلیات مکاتیب اقبال مرتبہ برنی میں شامل خطوط میں اقبال اعتراف کرتے ہیں کہ:

افسوس ہوتا ہے کہ میں نے اپنی عمر یورپ کا فلسفہ وغیرہ پڑھنے میں گنوائی خدا تعالیٰ نے مجھ کو قوائے دماغی بہت اچھے عطا فرمائے تھے اگر یہ قویٰ دینی علوم کے پڑھنے میں صرف ہوتے تو آج خدا کے رسول کی میں کوئی خدمت کرسکتا اور جب مجھے خیال آتا ہے کہ والد مکرم مجھے دینی علوم پڑھانا چاہتے تھے مجھے اور بھی قلق ہوتا ہے کہ باوجود اس کے صحیح راہ معلوم بھی تھی تو بھی وقت کے حالات نے اس راہ پر چلنے نہ دیا۔ [کریم بی بی کے نام ۱۹۱۹ء کا خط، ص ۱۵۷۔۱۵۸: ۳]

مجھے اعتراف ہے کہ میں شریعت کا ماہر نہیں ہوں۔ [۳:۲۱۸]

سود کے متعلق میں نے بحث دیکھی ہے مگر یہ مضمون سخت مشکل ہے اور اس پر لکھنے کے لیے فقہ کی کتابوں پر پورا عبور ہونا چاہیے..... کسی فرد واحد کا اجتہاد کسی مسئلے میں ناکافی سمجھا جائے گا۔ مختلف اسلامی ممالک کے لوگوں کا اسلامی ضمیر بحیثیت مجموعی ان مسائل کا فیصلہ کرے گا۔ [۱۰۰۸، جلد ۴، ۲۵ر جولائی ۲۴ کا خط]

ذاتی رائے میری خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو اگر علماء کا فتویٰ میری ذاتی رائے کے خلاف ہو تو سر تسلیم خم ہے۔ [۲۰۹]

۱۳ ممبروں اور خاکسار نے ووٹ دینے سے اس بناء پر انکار کیا کہ معاملہ زیر بحث کا ایک نہایت اہم پہلو ہے جس کا فیصلہ علماء سے استفسار کیے بغیر ایک ایسی انجمن کے لیے ناممکن ہے جو انجمن حمایت اسلام کے نام سے موسوم ہو میری ناقص رائے میں اس سوال کے مذہبی پہلو کو نظر انداز کر دینے سے اراکین کونسل نے خود انجمن کے لیے زندگی اور موت کا سوال پیدا کر دیا۔ [۲۰۹: ۴]

غرض یہ کہ جس طرح مفتی کے لیے علم وتقویٰ کے ضروری شرائط ہیں، اسی طرح مفتی کے علم سے مستفیض ہونے کے لیے ضروری ہے کہ سائل نکتہ رس، معاملہ فہم، زیرک ہو بالخصوص ایک ایسے معاملے میں جس کا اثر مسلمانوں کی اجتماعی

ساحل نومبر ۲۰۰۶ء

زندگی پر پڑتا ہو پوری چھان بین اور تحقیق و تدقیق ضرور ہے اور اس تحقیق و تدقیق کے لیے بھی وہی راہ اختیار کرنی چاہیے جو شریعت حقہ نے بتائی ہے، فرداً فرداً فتویٰ لینے سے کبھی کام نہ نکلے گا..... یہی راہ شریعت کی رو سے بھی انسب و اولیٰ ہے کہ حضرات علماء ایک جگہ جمع ہو کر ہر قسم کا اعتراض سننے اور پورے بحث و مباحثہ کے بعد مسلمانوں کے لیے ترک موالات کا پروگرام مرتب کریں۔ اپنے ہر فعل کے لیے خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی کتاب اللہ اور رسول اللہؐ کے عمل میں نظام کار تلاش کرنا چاہیے اور اس بات کا خیال بھی نہ کرنا چاہیے کہ ان کا نظام عمل گاندھی کے پروگرام کے مطابق ہے یا نہیں۔ [۹۶۰، ک م، ۱:۴]

۲۱ ممبروں نے جن میں خاکسار شامل تھا ووٹ دینے سے اس لیے انکار کیا کہ معاملہ زیر بحث کا ایک نہایت اہم مذہبی پہلو ہے جس کا فیصلہ علماء سے استفتاء کیے بغیر ممکن نہیں۔ [۵۹۸، ک م ا:۴]

مجھے اراکین انجمن حمایت اسلام سے یہ شکایت نہیں کہ انھوں نے کیوں الحاق کی تجویز پاس کی بلکہ یہ شکایت ہے کہ انھوں نے کیوں فیصلہ کرنے سے پہلے فقہائے اسلام سے استصواب نہیں کیا۔ اگر تمام حالات کو سننے کے بعد فقہائے اسلام کی یہی رائے ہو کہ الحاق قائم رکھا جائے تو میں بھی انجمن کے اراکین کا ہم نوا ہوں۔ [۹۶۳، جلد۴] میری ناقص رائے میں اس سوال کے مذہبی پہلو کو نظر انداز کر دینے سے اراکین کونسل نے خود انجمن کے لیے زندگی و موت کا سوال پیدا کر دیا ہے۔ [۹۶۴، نومبر ۱۹۲۰ء، جلد۴]

مغربی فکر و فلسفے کا مطالعہ اقبال نے قیام یورپ کے تین سالوں میں کیا، لیکن وطن واپسی پر وکالت، سیاسی مصروفیات قلب و نظر کی کشمکش اور گھریلو حالات کے باعث اقبال اس مطالعے سے دست کش ہو گئے تھے۔ شوکت علی کی دعوت پر لکھا تھا کہ تم علی گڑھ میں بلاتے ہو میں خدا گڑھ میں رہتا ہوں ایک طویل عرصے تک وہ خامشی اور تنہائی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں: میرے فرصت کے اوقات پرائیویٹ لٹریری کام کی نذر ہو جاتے ہیں اس کے علاوہ ایسے معاملے میں مطالعہ کتب کے بغیر مشورہ دینا ممکن نہیں، میں ایک عرصے سے فلسفے کا مطالعہ چھوڑ بیٹھا ہوں، صرف ایک آدھ مسئلے سے دلچسپی باقی ہے، جس کا تعلق آپ کے مضمون سے نہیں۔ [پیرزادہ ابراہیم حنیف کے نام یکم دسمبر ۱۹۲۳ء، ص ۴۹۸]

میاں عبدالرشید نے فلسفیانہ سوالات اثبات خدا، اسلام کے الحق ہونے سے متعلق اقبال سے کیے، اس کے جواب میں علامہ نے لکھا ''آپ کے خط کے جواب کے لیے ایک دفتر چاہیے جو میں لکھنے سے قاصر ہوں۔ سوالات ویسے ہی ٹیکنیکل ہیں جسے ریاضی کے مسائل جن کو بغیر خاص تربیت اور تعلیم کے سمجھنا مشکل ہے۔'' [۴:۳۱۶] مجھے اب اسلامی فلسفہ اور تصوف میں پہلی سی دلچسپی باقی نہیں رہی۔ [۸ مئی ۱۹۳۶ء، عمر دین کے نام ۴:۳۱۱] ایک مدت سے مطالعہ کتب ترک کر چکا ہوں، اگر کبھی کچھ پڑھتا ہوں تو صرف قرآن یا مثنوی رومی۔ [۴:۹۶]

ہم کتاب کے کیڑے ہیں اور مغربی دماغوں کے خیالات ہماری خوراک۔ [۲:۹۸] مغربی فلسفے اور علوم اسلامیہ سے گہری عدم واقفیت کے باوجود اقبال نے اسلام اور مغرب کے مابین تطبیق کی جو کوشش کی اس کے باعث وہ خطرناک گمراہیاں پیدا ہوئیں جس کا ایک رخ خطبات اقبال کے مباحث ہیں اور دوسرا رخ خطوط اقبال میں اقبال کے وہ دعوے ہیں جو علمی استناد سے خالی ہیں: مسلمانوں نے یونانی فلسفے کا مطالعہ کیا لیکن مجھے وثوق کامل ہے کہ وہ جلد اس منزل سے آگے نکل گئے اور بالآخر جدید فلسفے کی بنیاد ڈالی۔ ڈیکارٹ کا طریقہ تحقیق جسے جدید فلسفہ کی اساس سمجھا جاتا ہے۔ غزالی کی احیاء سے اس درجہ مشابہ ہے کہ ایک یورپین مورخ فلسفہ Leuis ڈیکارٹ کو سرقے کا مورد الزام قرار دیتا اگر موخر الذکر عربی سے واقف ہوتا، ہسپانیہ میں استقرائی منطق کی تشکیل و ترقی بھی مسلم فکر و فلسفہ کی مرہون ہے۔ [ایس حبیب احمد کے نام، ۱۹۲۲ء، ۳۸۲] کاش مجھے اس قدر فرصت ہوتی کہ میں اس موضوع پر ایک مبسوط کتاب لکھ کر مغربی فلسفیوں کو اس حقیقت سے

روشناس کر دیتا کہ دنیا کی مختلف قوموں کے فلسفیانہ خیالات ایک دوسرے سے کس قدر مشابہہ ہیں۔[نکلسن کے نام ۲۳۷، جنوری ۱۹۲۱ء] اقبال الگزنڈر سے متاثر تھے اس کے خطبات میں خدا اور الوہیت والے خطبے سے بے حد متاثر تھے۔ الگزنڈر نے لکھا تھا کہ یہ معلوم کرنا کہ الوہیت کیا چیز ہے اس کا احساس کیسا ہوتا ہے اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم خدا بن جائیں۔ [۲۲۸،نکلسن کے نام ۱۹۲۱ء] جذبہ الوہیت کائنات میں جاری وساری ہے یہ قوت ایک اکمل واعلیٰ انسان کے پیکر خاکی میں ظاہر ہوگی۔ خدا کے متعلق میرا عقیدہ الگزنڈر کے عقیدے سے مختلف ہے لیکن اگر انگریز ان جزوی اختلافات سے قطع نظر کر کے انسان کامل کے تخیل پر اپنے ایک ہم وطن مفکر کے افکار کی روشنی میں نظر ڈالیں تو انھیں یہ عقیدہ اس قدر اجنبی وغیر مانوس نہ معلوم دے گا۔[۲:۲۲۹]

کوئی یقین نہیں کر سکتا اسلام اس قدر جدید مذہب ہے.....مسلمانوں کو قرآن کی جدت کا کبھی احساس نہ ہوا بلکہ انھوں نے اس جدید کتاب کے مطالب وحقائق کو قدیم اقوام کے خیالات کی روشنی میں تفسیر کر کے اس کے اصل مطلب و مفہوم کو مسخ کر دیا۔ اب اقوام اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کے ساتھ خود اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی ضرورت ہے۔[۴:۹۸۳] دوسری جانب اقبال کہتے ہیں دلیل کم نظری قصہ جدید وقدیم۔ عورتوں کے متعلق ہٹلر جو تعلیم دے رہا ہے وہ عین قرآن کی روح کے مطابق ہے۔[۴:۱۵۸] قرآن کریم کی رو سے شیطان اور ابلیس دو مختلف ہستیوں کے نام ہیں۔[۹۸۲، ج۴] اسلام سے پہلے بنی نوع انسان میں شعور ذات کی تکمیل نہ ہوئی تھی۔[۴:۲۲۰]

نکلسن نے جو دیباچہ لکھا ہے وہ پڑھنے کے قابل ہے۔[۴:۳۹] مصنف کا ذہن اور زاویہ نگاہ مسلسل تغیر پذیر رہتے ہیں مگر مصنف کو کوئی خاطر میں نہیں لاتا۔[۴۳]

نکلسن نے دیباچے میں لکھا ہے کہ یہ کتاب ایک زبردست آواز ہے جو مسلمانوں کو محمد اور قرآن کی طرف بلاتی ہے اور اس آواز میں صداقت کی آگ ایسی ہے کہ ہم اس کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔[۴:۲۲۴] مثنوی فارسی عنقریب شائع ہوگی اس کا اردو دیباچہ دیکھنے کے قابل ہوگا۔[شاد کے نام ۱۹۱۵ء،ص۴۰۱:۲] یہ دیباچہ اقبال نے حذف کرا دیا لیکن اپنے افکار اور دیباچے کی تلخیص نکلسن کے تعارف اسرار خودی میں شامل کرادی۔

اقبال نے یہ بھی لکھا کہ ''یورپ کی قوموں نے ایک اعلیٰ کلچر کی بنیاد رکھی۔ مگر افسوس کہ ان کا عمل اس کلچر کے مقتضیات کے خلاف ہے۔ اس واسطے اغلب ہے کہ یہ کلچر بے کار ہو کر یورپ میں فنا ہو جائے گا۔[۴:۵۵۶] کیا اقبال جدید یورپ کے عروج کی تاریخ سے ناواقف تھے کیا وہ یورپی استعماریت، عیسائیت کی شکست، مذہبی ثقافت اقدار روایات کے ملبے پر قائم کافرانہ ملحدانہ یورپی کلچر کی حقیقت حیثیت، ماہیت سے بے خبر تھے۔ کیا وہ یورپی اقوام کے ظلم وستم کی تاریخ، استعماری بربریت سے آگاہ نہ تھے؟

اقبال نے لکھا تھا کہ مسلم فلسفیانہ لٹریچر بہت وسیع ہے اور یورپ کی لائبریریوں اور عالم اسلام میں بکھرا ہوا ہے۔ مسلم فلسفیانہ لٹریچر کا معتد بہ حصہ مخطوطات کی شکل میں محفوظ ہے اور اس کا سراغ لگانے کا کام ابھی باقی ہے۔ گزشتہ تین سو برسوں کے دوران مسلم دنیا فکری سطح پر نہایت غیر فعال رہی ہے۔ سنسکرت میں فلسفیانہ لٹریچر اس قدر منتشر نہیں ہے جتنا عربی میں بکھرا ہوا ہے۔[۴:۵۷۱،۵۷۲] جب اقبال نے عالم اسلام کے منتشر فلسفیانہ لٹریچر کا مطالعہ ہی نہیں کیا تو انھوں نے یہ دعویٰ کیسے کر دیا کہ'' مجھے وثوق کامل ہے کہ مسلمانوں نے جدید فلسفہ کی بنیاد ڈالی، ڈیکارٹ کا طریقہ تحقیق جو جدید فلسفہ کی اساس ہے غزالی کی احیاء سے مشابہہ ہے۔[۳:۳۸۲] کیا اقبال نے امام غزالی کی کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا تھا؟ غزالی اور ڈیکارٹ میں مشابہت وہی شخص تلاش کر سکتا ہے جس نے نہ ڈیکارٹ کا مطالعہ کیا ہو نہ امام غزالی کا۔ کیا اقبال کے بارے میں

یہ یقین کیا جاسکتا ہے کہ وہ غزالی اور ڈیکارٹ کے افکار سے قطعاً ناواقف تھے؟ کیا اقبال کی یہ رائے ذاتی ہے یا کسی مستشرق کی رائے کا سرقہ ہے جو اقبال نے اپنے نام سے پیش کی ہے۔ افسوس کہ مسلم فلسفے کے بارے میں اقبال کی بیشتر آراء ناقص، غلط سلط اور مستشرقین کے سرقوں پر مشتمل ہیں۔ ۱۹۳۶ء تک انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ حکیم برکات احمد کا رسالہ زمان ومکان پر ۱۹۲۴ء میں شائع ہو چکا ہے۔ ۱۹۳۲ء تک وہ شاہ اسماعیل شہید کی اہم کتابوں تقویۃ الایمان اور عبقات کے مطالعے سے محروم تھے اور انھیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ عبقات کہاں سے مل سکے گی۔

اقبال نے مسلمانوں کو فلسفہ اور لٹریچر کی تعلیم کے حصول سے منع کیا اور ذاتی طور پر بار بار اس خواہش کا اظہار کیا کہ ہمارے نوجوان عالم خود کو مسلم ریاضی، طبیعیات، کیمیا، تاریخ اور فقہ کے مطالعے کے وقف کر دیں۔ علم کی متذکرہ بالا شاخوں کا مطالعہ ہی آج کی اشد ضرورت ہے اور اسلام کا بہترین مفاد بھی اس میں مضمر ہے۔ محض اسی صورت میں آج کا مسلمان جدید علم کی بنیادوں سے آشنا ہو سکے گا اور ہم انھیں جدید مسائل کی معنویت کو سمجھنے کے قابل بنا سکیں گے۔ [۵۷۱، ۴:۵۷۲] اقبال نے فلسفے کو مسلمانوں کے مطالعے سے خارج کر کے کیا ایک عظیم غلطی کا ارتکاب نہیں کیا؟ کیا علوم جدیدہ کا مطالعہ جدید فلسفے کے بغیر کسی وقعت کا حامل ہے؟ کیا اقبال کو اس حقیقت کا اندازہ نہیں تھا کہ جدید سائنس جدید فلسفہ مغرب کے ثمرات کا نام ہے اور جدید فلسفہ پڑھے بغیر جدید سائنس سے اکتساب علم خطرناک رجحان ہوگا۔ کیا اقبال کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یونانی فلسفے کے مطالعے کے بعد ہی یونانی سائنس کا مطالعہ کیا گیا اور اسی لیے عالم اسلام کے تمام مدارس میں یونانی فلسفہ پڑھایا جاتا تھا کیونکہ فلسفہ پڑھنے والے سائنس سے بھی بخوبی واقف ہو جاتے تھے۔ کیا وجہ ہے کہ جمال الدین افغانی عبدہٗ، سرسید سے لے کر علامہ اقبال، ڈاکٹر منظور احمد، رشید جالندھری، وحید الدین خان، جاوید غامدی، یوسف قرضاوی اور مفتی تقی عثمانی تک مغربی فلسفے کی اہمیت اور حقیقت پر غور کیے بغیر جدید سائنس سے مرعوب ہو کر سب اسے اختیار کر لینے کا مشورہ دیتے ہیں جب تک جدید سائنس کے پس منظر پیش نظر وتہہ منظر سے واقفیت نہ ہو اس میں مضمر کفر کا ادراک کیسے ممکن ہے؟ عالم اسلام کی شکست کا سبب مغرب نہیں ہماری جہالت ہے۔ رسالت مآبؐ کے الفاظ میں ہم دانا نہیں ہیں کیونکہ اپنے زمانہ سے واقف نہیں۔ ''ہم چیزوں کے ظاہر کو دیکھتے ہیں ان کی حقیقت تک پہنچنے سے محروم ہیں''۔ حضرت عمرؓ کے الفاظ میں ہم وہ لوگ ہیں جو جاہلیت کی حقیقت سے ناواقف ہیں اور دین کی کڑیاں بکھیرنے کا کام اپنے جہل کے زور پر انجام دے رہے ہیں مگر اسے ''علم کامل'' سمجھتے ہیں۔

ایک جانب اقبال اس بات پر تاسف کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ دینی علوم کے مطالعے سے محروم رہے جب کہ والد کی خواہش بھی یہی تھی۔ علماء وفقہاء کے فتوے کے بغیر وہ ترک موالات کے سلسلے میں انجمن حمایت اسلام کے نقطۂ نظر سے شدید اختلاف کرتے ہیں اور علماء سے استفسار کے بغیر انجمن حمایت اسلام کے عاجلانہ فیصلوں کو انجمن کی حیات وموت کا معاملہ قرار دیتے ہیں۔ واضح طور پر لکھتے ہیں کہ میں شریعت کا ماہر نہیں ہوں۔ سود پر لکھنے کے لیے فقہ کی کتابوں پر عبور ہونا چاہیے۔ یہ مضمون سخت مشکل ہے لیکن اس تمام تر عجز، اعتراف عدم واقفیت کے باوجود قرآن پر کتاب لکھنے کا دعویٰ بھی فرماتے ہیں۔

اعلیٰ حضرت خود مجھے اپنی ریاست سے پنشن منظور کر دیں تا کہ میں اس قابل ہو جاؤں کہ قرآن پر اپنی کتاب لکھ سکوں، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ ایک بے نظیر کتاب ہوگی اور ان کے نام اور شہرت کو بقائے دوام بخشے گی۔ یہ جدید اسلام کے لیے ایک بڑی خدمت ہوگی اور میں شیخی نہیں بگھار رہا ہوں، جب یہ کہتا ہوں کہ آج دنیائے اسلام میں میں ہی وہ واحد شخص ہوں جو اس کو کر سکتا ہوں اگر آپ چاہیں تو میں اس کے لیے تیار ہو سکتا ہوں کہ اس کتاب کو اعلیٰ حضرت کی نذر

کردوں اوراس پر کسی طرح کا کوئی حق نہیں رکھوں یہ ایک قابل غور تجویز ہے۔[۱۷،جلد۴]

مضامین دریا کی طرح اُمڈے آ رہے ہیں اور حیران ہو رہا ہوں کہ کس کس کو نوٹ کروں۔اس حصہ کا مضمون ہوگا ''حیات مستقبلہ اسلامیہ''یعنی قرآن شریف سے مسلمانوں کی آیندہ تاریخ پر کیا روشنی پڑتی ہے۔اور جماعت اسلامیہ جس کی تاسیس دعوت ابراہیمی سے شروع ہوئی۔کیا کیا واقعات وحوادث آیندہ صدیوں میں دیکھنے والی ہے۔اور بالاخران سب واقعات کا مقصود وغایت کیا ہے؟ میری سمجھ اور علم میں یہ تمام باتیں قرآن شریف میں موجود ہیں اور استدلال ایسا صاف وواضح ہے کہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ تاویل سے کام لیا گیا ہے۔یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل وکرم ہے کہ اس نے قرآن شریف کا یہ مخفی علم مجھ کو دیا۔میں نے پندرہ سال تک قرآن پڑھا ہے اور بعض آیات وسورتوں پر مہینوں بلکہ برسوں غور کیا ہے اور اس کا لکھنا آسان نہیں۔بہر حال میں نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ اس کو ایک دفعہ لکھ ڈالوں گا اور اس کی اشاعت میری زندگی کے بعد ہوجائے گی یا جب اس کا وقت آئے گا اشاعت ہوجائے گی۔[۲:۶۱۸]

فلسفے اور تصوف سے دلچسپی ختم ہوجانے کے بعد اقبال نے درج ذیل موقف اختیار کیا۔

اسی واسطے لاٹسا کا فلسفہ یورپ میں مقبول نہ ہوا۔گو اس کی تعلیم اس قسم کی تھی کہ وحدت الشہود اور وحدت الوجود دونوں کی طرف میلان رکھنے والی طبائع کے لیے موزوں تھا۔مگر میرا مذہب تو یہ ہے کہ یہ سارے مباحث مذہب کا مفہوم غلط سمجھنے سے پیدا ہوتے ہیں مذہب کا مقصود عمل ہے نہ [کہ] انسان کے عقلی اور دماغی تقاضوں کو پورا کرنا۔اسی واسطے قرآن شریف کہتا: **وما اوتیتم من العلم الاقلیلا** میں نے تمہیں علم کا بہت ہی تھوڑا سا حصہ دیا ہے۔بنی اسرائیل ۸۵]۔ اگر مذہب کا مقصود عقلی تقاضوں کو پورا کرنا ہو بھی [جیسا کہ ہنود کے رشیوں اور فلسفیوں نے خیال کیا ہے] تو زمانہ حال کی خصوصیات کے اعتبار سے اس کو نظر انداز کرنا چاہیے۔اس وقت وہی قوم محفوظ رہے گی جو اپنی ملی روایات پر قائم رہ سکے گی۔ اس دور میں سب مٹ جائیں گے ہاں باقی وہ رہ جائے گا جو اپنی راہ پر قائم ہے اور پکا اپنی ہٹ کا ہے۔[نیاز کے نام،ص۵۳۲]

حالانکہ اسلامی نقطۂ خیال سے تزکیۂ نفس کا مقصد محض ازیادِ یقین واستقامت ہے۔اخلاقی اور عملی اعتبار سے متصوفین اسلامیہ کی حکایات ومقولات کا مطالعہ نہایت مفید ہے لیکن دین کی اصل حقیقت ائمہ اور علماء کی کتابیں پڑھنے سے ہی کھلتی ہے۔اور آج کل زمانے کا اقتضا یہ ہے کہ علم دین حاصل کیا جائے اور اسلام کے علمی پہلو کو نہایت وضاحت سے پیش کیا جائے۔حضرات صوفیہ خود کہتے ہیں کہ شریعت ظاہر ہے اور تصوف باطن لیکن اس پر آشوب زمانے میں وہ ظاہر جس کا باطن تصوف ہے معرض خطر میں ہے اگر ظاہر قائم نہ رہا تو اس کا باطن کس طرح قائم رہ سکتا ہے؟ مسلمانوں کی حالت آج بالکل ویسی ہے جیسے کہ اسلامی فتوحات ہندوستان کے وقت ہندوؤں کی تھی یا ان فتوحات کے اثر سے ہوگئی۔

ہندو قوم کو اس انقلاب کے زمانے میں منو کی شریعت کی کورانہ تقلید نے موت سے بچالیا۔اپنی شریعت کی حفاظت کی وجہ سے ہی یہودی قوم اس وقت تک زندہ ہے ورنہ اگر فیلو[پہلا یہودی متصوف]قوم کے دل ودماغ پر حاوی ہوجاتا تو آج یہ قوم دیگر اقوام میں جذب ہوکر اپنی ہستی سے ہاتھ دھو چکی ہوتی۔[ص۴۷۲-۴۷۳،۲:۴۷۳]

اقبال نے لکھا تھا کہ دنیا میں چار اشخاص ایسے ہیں کہ جو بھی ان کے طلسم میں گرفتار ہوجاتا ہے مشکل سے رہائی پاتا ہے اور وہ چار ہیں محی الدین ابن عربی،شنکرا چاریہ،بیدل اور ہیگل۔[۲:۸۶۲]

حضرت اقبالؒ بھی تمام عمر حضرت محی الدین ابن عربیؒ اور ہیگل کے طلسم سے آزاد نہ ہوسکے۔محی الدین ابن عربیؒ کے طلسم سے رہائی کے لیے اقبال نے زبردست کوششیں کی لیکن حضرت ابن عربیؒ نے انھیں ایسا گرفتار کیا کہ وہ کبھی ان کی محبت سے رہائی نہ پاسکے ایک جانب محی الدین ابن عربیؒ کے افکار کو الحاد زندقہ قرار دیتے اور اس کے بارے میں یہ اعلان

فرماتے کہ ابن عربیؒ کے افکار کی شرعی تاویل توجیہہ وتوضیح وتشریح ممکن نہیں ہی ہے۔ دوسری طرف مغرب اور اسلام میں پل تیار کرنے کے لیے انھیں وحدت الوجود کے سوا کوئی دوسرا سہارا نہ مل سکا جب کہ ان کا خیال تھا کہ:

یہی وہ وحدت الوجود ہے جس پر خواجہ حسن نظامی اور اہل طریقت کو ناز ہے اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر رحم کرے او رہم غریب مسلمانوں کو ان کے فتنے سے محفوظ رکھے [۴۴۰ فوق کے نام دسمبر ۱۹۱۵ء کا خط] پھر حسن نظامی سے جنگ ہوتی ہے پھر صلح ہوجاتی ہے۔ اور اقبال کہتے ہیں کہ درحقیقت ہم میں اور ان میں کوئی اختلاف ہی نہیں ہے۔ [ص ۴۴۰]

خواجہ حسن نظامی کے نام لکھتے ہیں کہ مجھے خوب معلوم ہے کہ آپ کو اسلام اور پیغمبر اسلام سے عشق ہے پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ آپ کو ایک حقیقت اسلامی معلوم ہوجائے اور آپ اس سے انکار کریں بلکہ مجھے ابھی سے یقین ہے کہ آپ بالآخر میرے ساتھ اتفاق کریں گے۔ میری نسبت بھی آپ کو معلوم ہے۔ میرا فطری اور آبائی میلان تصوف کی طرف ہے اور یورپ کا فلسفہ پڑھنے سے یہ میلان اور بھی قوی ہوگیا تھا کیونکہ فلسفۂ یورپ بحیثیت مجموعی وحدت الوجود کی طرف رُخ کرتا ہے مگر قرآن پر تدبر کرنے اور تاریخ اسلام کا بغور مطالعہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے اپنی غلطی معلوم ہوئی اور میں نے محض قرآن کی خاطر اپنے قدیم خیال کو ترک کردیا اور اس مقصد کے لیے مجھے اپنے فطری اور آبائی رجحانات کے ساتھ ایک خوفناک دماغی اور قلبی جہاد کرنا پڑا۔ [۲:۴۴۸]

رہبانیت اور اسلام پر مضمون ضرور لکھوں گا مگر آپ کے مضمون کے بعد رہبانیت عیسائی مذہب کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر قوم میں پیدا ہوتی ہے اور ہر جگہ اس نے شریعت اور قانون کا مقابلہ کیا ہے اور اس کے اثر کو کم کرنا چاہا ہے اسلام حقیقت میں اسی کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے تصوف جو مسلمانوں میں پیدا ہوا اور تصور سے میری مراد ایرانی تصوف ہے اس نے ہر قوم کی رہبانیت سے فائدہ اٹھایا ہے اور ہر راہبی تعلیم کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کی ہے۔ [سلیمان ندوی کے نام اس سے پہلے ۱۹۱۳ء میں ایک خط میں تصوف کو غیر اسلامی قرار دیا اب تصوف کی دو قسمیں ہوگئیں عجمی اور اسلامی] یہاں تک کہ قرمطی تحریک سے بھی تصوف نے فائدہ اٹھایا ہے محض اس وجہ سے کہ قرمطی تحریک کا مقصد بھی بالآخر قیودِ شرعیہ اسلامیہ کو فنا کرنا تھا۔ بعض صوفیا کی نسبت تاریخی شہادت بھی اس امر کی موجود ہے کہ وہ قرمطی تحریک سے تعلق رکھتے تھے۔

حضرت امام ربانی نے مکتوبات میں ایک جگہ بحث کی ہے کہ گستن اچھا ہے یا پیوستن میرے نزدیک گستن عین اسلام ہے اور پیوستن رہبانیت یا ایرانی تصوف ہے اور اسی کے خلاف میں صدائے احتجاج بلند کرتا ہوں۔ [سلمان ندوی کے نام مسلمانوں میں تصوف کا سبب بدھ مت کو قرار دیا گیا تھا اب عجمی لوگ وایرانی اس کا سبب بن گئے۔ نیاز الدین کے نام ۱۹۱۶ کے خط میں لکھا تصوف کی عمارت یونانی بے ہودگی پر تعمیر کی گئی کون سا موقف درست ہے؟] ۔ گذشتہ علمائے اسلام نے ایسا ہی کیا ہے اور اس بات کی تاریخی شہادت موجود ہے آپ کو یاد ہوگا کہ جب آپ نے مجھے سر الوصال کا خطاب دیا تھا تو میں نے آپ کو لکھا تھا کہ مجھے سر الفراق کہا جائے اس وقت میرے ذہن میں یہی امتیاز تھا جو مجدد الف ثانی نے کیا ہے آپ کے تصوف کی اصطلاح میں اگر میں اپنے مذہب کو بیان کروں تو یہ ہوگا کہ شان عبدیت انتہائی کمال روح انسانی کا ہے اس سے آگے اور کوئی مرتبہ یا مقام نہیں یا محی الدین ابن عربی کے الفاظ میں ''عدم محض'' ہے یا بالفاظ دیگر یوں کہیے کہ حالت سکر منشائے اسلام اور قوانین حیات کے مخالف ہے اور حالت صحو جس کا دوسرا نام اسلام ہے، قوانین حیات کے عین مطابق ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا یہ تھا کہ ایسے آدمی پیدا ہوں جن کی مستقل حالت کیفیت صحو ہو یہی وجہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں صدیق وعمر تو بکثرت ملے مگر حافظ شیرازی کوئی نظر نہیں آتا۔ مضمون بہت طویل ہے اور اس

مختصر خط میں سما نہیں سکتا میں ان شاء اللہ اس پر مفصل بحث کروں گا جب حالات مساعدت کریں گے مگر شیخ محی الدین ابن عربی کے ذکر سے ایک بات یاد آ گئی جو عرض کرتا ہوں اس واسطے کہ آپ کو غلط فہمی نہ رہے۔ میں شیخ کی عظمت وفضیلت کا قائل ہوں اور ان کو اسلام کے بہت بڑے حکماء میں سمجھتا ہوں مجھ کو ان کے اسلام میں کوئی شک نہیں۔ [کیونکہ جو عقائد [مسئلہ قدم ارواح ومسئلہ وحدت الوجود] ان کے ہیں ان کو انھوں نے فلسفہ کی بنا پر نہیں مانا بلکہ نیک نیتی سے قرآن کی آیات سے استنباط کیا ہے پس ان کے عقائد صحیح ہوں یا غلط قرآن کی تاویل پر مبنی ہیں یہ دوسری بات ہے کہ جو تاویل ان کی ہے وہ منطقی یا منقولی اعتبار سے صحیح ہے یا غلط۔ میرے نزدیک ان کی تعبیر یا تاویل جو کچھ ہے صحیح نہیں ہے اس واسطے گو میں ان کو ایک مخلص مسلمان سمجھتا ہوں مگر ان کے عقائد کا پیرو نہیں ہوں۔

اقبال کے یہاں تصوف کے حوالے سے انتقال تک مختلف ومتضاد نقطۂ ہائے نظر تواتر وتسلسل کے ساتھ ملتے ہیں۔ یہ نقطۂ نظر اقبال کے الفاظ میں تین سو صفحات پر مشتمل ہے اور ان کے مکاتیب سے مرتب کیا گیا ہے جو ساحل کی کسی خصوصی اشاعت میں پیش کیا جائے گا۔ اقبال ۱۸۹۶ء میں تصوف کے مخالف ہوئے پھر ۱۹۰۵ء تک تصوف کے قائل رہے پھر تصوف کے منکر ہو گئے پھر تصوف کے دشمن ہو گئے۔ ابن عربیؒ کے شدید مخالف رہے۔ نظام الدین اولیاء کے بارے میں لکھا مسیح وخضر سے اونچا مقام ہے تیرا کیا ایک بزرگ پیغمبر سے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہو سکتا ہے جب کہ قرآن کا حکم ہے کہ رسول اللہ اور دیگر انبیاء میں تفریق نہ کرو۔ پہلے ابن عربی کے افکار کی کسی تاویل کے قائل نہ تھے لیکن اکبر نے خط لکھا تو وحدت الوجود اور دیگر افکار کی تاویل کے قائل ہو گئے۔ حسن نظامی سے معرکہ ہوا تو وجودی تصوف اور عجمی تصوف اور اسلامی تصوف کی تقسیم فرمائی اور تصوف اسلامی کے قائل ہو گئے کسی کو لکھا کہ تصوف یونانی خرافات کا نتیجہ ہے کسی کو یہ لکھا کہ تصوف بدھ مت کا خود کاشتہ ہے کسی کو تصوف ایرانی اثرات کا ماحصل بتلایا۔ مثنوی لکھی تو فرمایا کہ مثنوی از خود نہیں لکھی لکھنے کی ہدایت ہوئی ہے اور لکھنے کے لیے میرا انتخاب کیا گیا ہے۔ پھر فرمایا کہ یہ مثنوی اللہ کے حکم سے لکھی ہے لہٰذا تصوف کے خلاف جہاد اکبر کا اعلان کیا اور اسے جڑ سے اکھاڑ دینے کی تحریک چلائی لیکن اچانک دین وایمان کے اس معرکہ سے پیچھے ہٹ گئے۔

علامہ اقبال نے مختلف مواقع پر خواجہ نظام الدین سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ ۱۹۰۴ء میں اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد پر بلوچستان میں ایک فوجداری مقدمہ قائم ہوا تو وہ بہت پریشان ہوئے اس دور میں اقبال نے ۳۵ راشعار کی ایک نظم بعنوان برگ گل حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء دہلوی کو نذر کرنے لکھی اور خواجہ حسن نظامی کی وساطت سے حضرت محبوب الٰہیٰ کے مزار پر عرس کے موقع پر پڑھی گئی۔ اور اس کا مندرجہ ذیل شعر لکھ کر مزار کے دروازے پر لٹکا دیا گیا

ہند کا داتا ہے تو تیرا بڑا دربار ہے
کچھ ملے مجھ کو بھی اس دربار گوہر بار سے

۱۹۰۵ء میں یورپ کی روانگی کے موقع پر اقبال نے التجائے مسافر کے عنوان سے ایک اور نظم لکھی اور دہلی میں ان کے مزار پر حاضری کے موقع پر مزار کے سرہانے بیٹھ کر پڑھی۔ یہ نظم ''بانگ درا میں موجود ہے۔

اپنے بھائی کی رہائی کے لیے لکھی گئی نظم کے کئی شعر امیر خسرو کے مزار کے سامنے دیوار پر لکھے ہیں۔ ایک شعر

محو اظہار تمنائے دل ناکام ہوں لاج رکھ لینا کہ میں اقبال کا ہم نام ہوں

[حضرت محبوب الٰہیؒ کے چہیتے مرید کا نام بھی اقبال تھا][۹۹۷:۴]

لاہور کے ایک مجذوب اللہ اکبر اور سلطان سرائے کی نامعلوم مجذوبہ سے بھی شدید متاثر تھے اور کشن پرشاد سے ان ہستیوں کے بارے میں خط وکتابت رہتی تھی۔ اقبال ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور شاد کا پیغام پہنچاتے تھے۔ [۵۸۲]

قلندر صاحب بڑے پائے کے بزرگ تھے ان کے عرس پر روپیہ صرف کرنا اور مسکینوں کو کھانا کھلانا بڑی برکت کا باعث ہے۔[اپریل ۱۹۲۴ء، ص ۵۱۷] اقبال مرحوم لدھیانے والی بیوی کی نماز جنازہ پڑھانے کے لیے کسی ایسے بزرگ کی تلاش میں تھے جن کا تعلق قادری سلسلے سے ہو مگر اس میں ناکامی ہوئی تو خود نماز جنازہ پڑھائی۔[۵۵۹] حضرت اقبال ۱۹۱۵ء تک خود کو علمی طور پر تصوف کے مباحث کا اہل نہ سمجھتے تھے لیکن اچانک ۱۹۱۶ء میں تصوف پر کتاب کا آغاز کرتے ہیں جو آخر کار نامکمل رہی۔

ضیاء الدین برنی کے نام لکھتے ہیں تصوف کی کتاب پر نظر ثانی کرنے کے لیے میں کسی طرح اہل نہیں ہوں۔ کیوں کہ مجھے تصوف سے معمولی واقفیت ہے اور وہ بھی سطحی۔ اس کام کے لیے موزوں ترین آدمی خواجہ حسن نظامی ہیں البتہ اگر آپ تصوف کی تاریخ لکھیں اور یہ بتائیں کہ تاریخی اعتبار سے تصوف کا تعلق اسلام سے ہے یا نہیں تو یہ رسالہ مفید ثابت ہوگا۔[ص ۴۲۳، ۳۰/ اکتوبر ۱۹۱۵ء: ۲]

علامہ اقبال جدید دنیا میں ابھرنے والی نئی طاقت امریکہ سے بھی قطعاً ناواقف تھے وہ فیڈرلسٹ پیپرز، ۱۷۸۸ء کے امریکی دستور، بل آف رائٹ امریکی دستور میں مضمر بنیادی حقوق اور اس کے مباحث سے بھی واقفیت نہ رکھتے تھے، انھیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ امریکیوں نے نو کروڑ سرخ ہندیوں کے قتل عام پر اپنی عظیم اقدار روایات کی بنیاد رکھی تھی، اسی لاعلمی کے باعث وہ ایک تعزیتی خط میں لکھتے ہیں:

یہ صرف ان کی شخصیت تھی کہ جس نے ہمیں امریکی عوام اور ان کے بلند اور بے غرض کردار کی طرف متوجہ کیا.....۔ ڈاکٹر اسٹرے ٹن کا ہی اثر ہے کہ یہاں کچھ لوگ امریکی یونیورسٹیوں میں داخلہ کا ارادہ کرنے لگے ہیں اور میں بھی ان میں سے ایک ہوں[۶۸:۴] امریکہ کے بارے میں یہ ناواقفیت آج بھی جدیدیت پسندوں کے یہاں مشترکہ طور پر موجود ہے۔ وحید الدین خان، منظور احمد، رشید جالندھری سے جاوید غامدی تک کوئی امریکہ کے اصل چہرے سے واقف نہیں۔ اور امریکہ کے بارے میں کچھ جاننا بھی نہیں چاہتے اور نہ کچھ پڑھنے کے لیے تیار ہیں۔

اقبال کے یہاں تضادات کی توجیہات سے پہلے ہمیں ان کی ذاتی زندگی کے عمیق مطالعے کی از سر نو ضرورت ہے، اس کے بغیر ان کی عظیم شخصیت جو کبھی یک لخت اور کبھی لخت لخت نظر آتی ہے اس کا تجزیہ محال ہے۔ تجزیہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ یہ بات پیش نظر رکھے کہ اس دنیا میں حضرت اقبالؒ ایماویگے ناست، عطیہ فیضی، اور اکبر الہ آبادی کے سوا کسی کو اپنا ہم دم و ہم راز، دمساز و ہم آواز نہیں سمجھتے تھے، وہ ہند سے ہجرت کرنا چاہتے تھے اور یہ خواہش ۱۹۳۷ء میں بھی شدت سے موجود تھی لیکن ان کے بیچ اس راہ میں سنگ گراں تھے۔ خطوط میں لکھتے ہیں: میں اب تک ایک خواب دیکھنے والا ہوں [عطیہ کے نام، ص ۲۰۶] جب آدمی کوئی زبان نہیں لکھ سکتا تو اس کا قلم بہت دل شکستہ ہوتا ہے.....میرے پاس بالکل وقت نہیں ہے کہ میں اپنی جرمن صحیح کر سکوں مئی ۱۹۱۱ء۔[ایما کے نام، ص ۲۲۳]

جرمن زبان سے محدود واقفیت ہمارے درمیان ایک دیوار کی طرح کھڑی ہے اگر میرے خطوط مختصر ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ میرے پاس لکھنے کو کچھ نہیں ہے بلکہ یہ کہ میرا ذریعہ اظہار ناقص ہے ہائیڈل برگ میں جرمن لکھنے کی مشق نہ کی یہ وہ پہلی تحریر ہے جو میں اس زبان میں لکھ رہا ہوں۔[۱۳۱] بڑے افسوس کی بات ہے کہ میں اپنی جرمن زبان بھول گیا ہوں میں بہت مصروف تھا اور زیادہ نہ سیکھ سکا[ص ۱۳۶] میں اپنی جرمن زبان بالکل بھول چکا ہوں آپ ہی کیوں انگریزی نہیں سیکھ لیتیں؟[۱۴۰] میں اپنی جرمن تمام تر بھول چکا ہوں آپ انگریزی کیوں نہیں سیکھ لیتیں[۱۴۲] میرا جسم یہاں ہے میرے خیالات جرمنی میں ہیں[۱۴۶] میرے پاس کچھ پیسے جمع ہو جائیں گے تو میں یوروپ میں اپنا گھر بناؤں گا یہ میرا تصور ہے اور میری تمنا ہے کہ یہ سب پورا ہوگا۔ ایما کے نام[۱۶۳] ۱۹۰۹ء کا خط

ہائیڈل برگ میں قیام ایک خوبصورت خواب لگتا ہے میں اس خواب کو دہرانا چاہتا ہوں[۱۶۴]

میرا ارادہ تو اولین فرصت میں اس ملک سے ہجرت کر جانے کا ہے وجہ آپ کو معلوم ہے مجھے اپنے بھائی کا ایک طرح کا اخلاقی قرضہ ادا کرنا ہے جو زنجیر پا بنا ہوا ہے میری زندگی حد درجہ تلخ ہے وہ مجھ پر میری بیوی مسلط کر رہے ہیں..... میں اس بد بخت ملک کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیر آباد کہدوں یا شراب میں پناہ ڈھونڈوں جو خودکشی کو آسان تر بنا دیتی ہے۔[۱۷۴] عطیہ کے نام

آپ لوگوں کی صحبت سے زیادہ تسکین مجھے کہیں میّسر نہیں آ سکتی۔[۱۷۶] عطیہ کے نام

میں بے تابی سے اس وقت کا منتظر ہوں جب میں دوبارہ آپ کے وطن میں آپ سے مل سکوں گا[ایمّا کے نام ۱۹۰۹ء] مجھے جرمنی بہت پسند ہے اس نے میرے آدرشوں پر بہت اثر کیا ہے[۱۹۳]

میرے دل میں یوروپ اور بالخصوص جرمنی کو دوبارہ دیکھنے کی بڑی آرزو پیدا ہو جاتی ہے۔ آہ وہ دن جب میں جرمنی میں تھا۔[۱۹۳]

اپنے تمام تر وجود کو آپ کے سامنے بے نقاب کر دینا چاہتا ہوں۔ میں آپ سے کوئی بات نہیں چھپاتا ایسا کرنا گناہ سمجھتا ہوں۔[۱۷۸] عطیہ کے نام

بعض اوقات خود کو بالکل تنہا محسوس کرتا ہوں میرے دل میں یورپ اور بالخصوص جرمنی دوبارہ دیکھنے کی بڑی آرزو پیدا ہو جاتی ہے۔[ایمّا کے نام، ص۱۹۳]

قصد تھا کہ زندگی کے باقی دن جرمنی اور اٹلی میں گزاروں مگر بچوں کی تربیت کس پر چھوڑوں۔[جون، ۱۹۳۷ء ص۲۲:۴]

مجھے جرمنی بہت پسند ہے اس نے میرے آدرشوں پر بہت اثر کیا ہے میرے دل میں یورپ اور بالخصوص جرمنی کو دوبارہ دیکھنے کی بڑی آرزو پیدا ہو جاتی ہے۔[۱۹۳] ۱۹۰۹ء کا خط ہے پیام مشرق میں ویمر کا اضافہ حافظ کو قلم زد کر دیا گیا۔

جب آدمی کوئی زبان نہیں لکھ سکتا تو اس کا قلم بہت دل شکستہ ہوتا ہے..... میرے پاس بالکل وقت نہیں ہے کہ اپنی جرمن صحیح کر سکوں مئی ۱۹۱۱ء کو ایمّا کو خط[۲۲۳]

میں اس ہجوم میں تنہا رہتا ہوں ایک فرد واحد بھی ایسا نہیں جس سے دل کھول کر اپنے جذبات کا اظہار کر سکوں لارڈ بیکن نے کہا ہے جتنا بڑا شہر ہو اتنی ہی بڑی تنہائی ہوتی ہے سو یہی حال میرا لاہور میں ہے[۲۷] زیارت روضہ رسول کی آرزو دل میں پرورش پا رہی ہے دیکھیے کب جوان ہوتی ہے[۲۲۸] لاہور کی بستی میں کوئی ہمدم دیرینہ نہیں۔[اکبر کے نام ۲۳۲:۲]

جس زمانے میں میں زندہ تھا یا یوں کہیے کہ زندہ دل تھا تو تجربے نے یہ اصول سکھایا کہ جس معشوق سے زیادہ محبت ہو اس سے اصولاً زیادہ بے اعتنائی کرنی چاہیے۔ یار لوگوں نے فرمایش کی ہے کہ ہر اصول پر ایک مفصل رسالہ لکھنا چاہیے کہ تماش بینوں کے لیے رہنمائی کا کام دے۔ سو بندہ نے ایک رسالہ ''موسوم بہ اجرالسکوت'' تحریر کیا ہے جس میں سکوت کے ایسے ایسے دلائل پیش کیے ہیں کہ فریدالدین عطار بھی اگر اس رسالے کو پڑھتے تو اپنے فضائلِ خاموشی کو فراموش کر جاتے۔ وہ سینہ بہ سینہ شائع ہوتا تھا۔ مگر اب اس کا نشان باقی نہیں کہ وہ محرکات نہیں جو اس کی تصنیف کا باعث ہوئے غرض کہ سکوت بڑی اچھی چیز ہے[پرشاد کے نام، ص۴۰۵]

المیہ یہ ہے کہ جمال الدین افغانی سے لے کر علامہ اقبال، شبلی، حمیدالدین فراہی، اور عصر حاضر میں عالم اسلام کے متکلمین، مفکرین اور فلاسفہ کی اکثریت مغربی فکر و فلسفے، جدید سائنس اور سوشل سائنس کو غیر اقداری [Value nutral] غیر جانبدار تصور کرتی ہے۔ یہ حضرات جن کی اکثریت کے اخلاص میں شبہ کی گنجائش بہت کم ہے۔ جدید سائنس کی مادی

فتوحات ومظاہر، چکاچوند، اور آسائشوں سے اس درجہ مسحور، مرعوب اور مغلوب ہیں کہ انھیں جدید سائنس کے ثمرات کا بنیادی فلسفہ بھی قرآن وسنت کی بنیادوں میں نظر آتا ہے۔ ان تمام مفکرین کے یہاں عروج کی دیرینہ اور مشترکہ خواہش نے ان سے وہ بصیرت سلب کرلی جو انھیں مغرب اور اسلام کے مابین ناقابل عبور، ناقابل تسخیر آہنی دیوار دکھا سکتی تھی۔

''العرۃ الوثقیٰ'' سے لے کر خطبات احمدیہ، الازہر، تفسیر المنار، تحقیقات فراہی، دبستان شبلی، خطبات اقبال، طلوع اسلام الرسالہ، اشراق، جدید معیشت وتجارت، اسلامی بینکاری، جمہوریت کی اسلام کاری جیسی کوششیں عالم اسلام میں مسلسل عبرتناک ناکامی سے دوچار ہوئی ہیں۔ اس صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے فواد عجمی لکھتے ہیں ''ایک کے بعد ایک مسلمان معاشروں میں لبرل ازم اور قومی بوژوا روایت کے بارے میں لکھنا ان افراد کا تعزیت نامہ لکھنے کے مترادف ہے جنھوں نے ناممکنات کو ممکن بنانے کی کوشش کی اور ناکام ہوگئے۔'' ساحل انہی جدیدیت پسندوں کے تعزیت نامے لکھنے کا فریضہ انجام دے رہا ہے جو بہت سے لوگوں کو ناگوار ہے۔

عام طور پر ان مفکرین کی تحریروں اور خطبات اقبال کو مغرب ومشرق کے درمیان پل قرار دیا گیا لیکن پل ایک مصنوعی تخلیق ہے جو دو ٹھوس اکائیوں کو ملاتی ہے لیکن ان میں سے کسی کا حصہ نہیں ہوتی۔ تہذیبوں کو پل کی طرح نہیں ملایا جاسکتا۔ اگر تہذیبوں کی مابعد الطبیعیات، الٰہیات، عقائد یکساں ہوں تو ان کے مابین فطری اتحاد جنم لے سکتا ہے۔ لیکن دو مختلف مابعد الطبیعیات الٰہیات وعقائد پر منحصر تہذیبیں کسی پل کے ذریعے آپس میں نہیں مل سکتیں۔ یہ تصور ہی نہایت غیر علمی ہے جس کی دھجیاں رینے گینوں کی قیادت میں روایت کے دبستان نے علمی طور پر اڑائی ہیں۔ خطبات مغرب کو اسلام سے آشنا بنانے کے بجائے اسلام کو مغرب کے سانچے میں ڈھال دینے کا تجربہ تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح پیٹر اعظم نے یورپ کو روس کا حصہ بنانے سے زیادہ روس کو یورپ کا حصہ بنانے میں کامیابی حاصل کی۔ [۱۶۹۸ء میں یورپ کے دورے سے واپسی پر پیٹر نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے امراء کی داڑھیاں منڈوادیں اور لمبے چغوں اور مخروطی ٹوپیوں پر پابندی عائد کر دی۔] خطبات کو مغرب میں جدیدیت کا مشرقی قلعہ سمجھا گیا جس کا اظہار نکلسن نے اسرار خودی کے مقدمے میں کیا ہے۔ اسی لیے آرنلڈ نے خطبات کو سب سے بڑا فکری کارنامہ قرار دیا تھا۔ کیا ہم پسماندہ رہے بغیر مغرب سے مختلف ہوسکتے ہیں؟ اگر نہیں تو کیا ہم پسماندگی کو عزیز رکھتے ہوئے جدیدیت کو رد کردیں کہ یہ آزادی اور سرمایہ کے بطن سے جنم لیتی ہے، اس کی تخلیق کا دوسرا کوئی فطری طریقہ موجود نہیں ہے۔ اقبال اس سوال کا سامنا کرنے سے گھبراتے ہیں اور اس تصور کے ساتھ ان کے فلسفے کا سانس اکھڑنے لگتا ہے کیونکہ ان کا فلسفہ ایمان ویقین کے بجائے محض عقل وتفکر کی سطح پر کلام کرتا ہے۔ لیکن ان کی شاعری کا ایک بڑا حصہ جذبے کی سطح سے کلام کرتا ہے لہٰذا جہاں جہاں ان کی شاعری تعقل، تفکر وتفلسف سے معریٰ رہتی ہے وہاں وہاں وہ اس سوال کے ایسے ایسے جواب دیتی ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اس مقام پر اقبال کی شاعری مغربیت اور جدیدیت کو جس طرح شکست دیتی ہے اس فتح کی سرشاری کا انداز ہی نہیں ہوسکتا۔ یہ سرشاری ایسی مستی خودی اور بے خودی طاری کردیتی ہے کہ اقبال کے مداح خطبات کے الحاد وزندقہ کو بھی شاعری کا بروز سمجھنے لگتے ہیں۔ اقبال نے خطبات کا دفاع کرنے کے بجائے شاعری پر فخر کیا ہے۔

پس از من شعرِ من خوانند و دریا بند وی گویند
جہا نے را دگر گوں کر دیک مرد خود آ گا ہے

میرے بعد لوگ میرے شعر پڑھتے ہیں روتے اور کہتے ہیں کہ ایک مرد خود آ گاہ نے دنیا کو دگر گوں کردیا [خطبات کے لئے اقبال نے کوئی شعر نہیں کہا]

ساحل نومبر ۲۰۰۶ء